سہ ماہی اجتہاد۔ خصوصی اشاعت ''اسلام اور مغرب''،

(اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد)، شمارہ ۲ (دسمبر ۲۰۰۷ء)، ۱۴۶ صفحات، قیمت درج نہیں

عبدالقدیر سلیم *

''اسلام اور مغرب'' ایک ایسا پیش پا اُفتادہ اور ساتھ ہی سدا بہار موضوع ہے، جس پر برِ عظیم پاک و ہند میں سو سال سے زیادہ عرصے سے طبع آزمائی ہو رہی ہے۔ سید احمد خان مرحوم (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)، جن کے نام سے پہلے ''سر'' اور بعد میں ''خان'' لکھے بغیر اُن کی شناخت ناممکن ہے، جھٹکا کی ہوئی مُرغی کو چھُری کانٹے سے کھانے اور کوٹ پتلون پہننے کو اسلام اور مغرب میں رابطے اور مفاہمت کے لیے اہم سمجھتے تھے، جب کہ دینی مدارس کے علماء انگریزوں کے گلاس میں پانی پینے کے بھی روادار نہیں تھے۔ یہ سدا بہار بحث اب پُرانی ہو کر بھی نئی دکھائی دے رہی ہے اور ہر دانش ور اس میں سے اپنے حصے کا فشردہ (جُوس) نکال رہا ہے۔

اور یہی مُجلہ اجتہـــــاد کے دوسرے شمارے کا موضوعِ خاص ہے۔ مُجلّے میں ممتاز احمد نے ''اسلام اور مغرب: چند اہم مباحث'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں اِن دو اصطلاحوں کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے: ''کیا مغرب ایک تہذیبی اکائی ہے، یا جغرافیائی؟ اگرچہ وہ مغرب کو ایک تہذیب بھی کہتے ہیں تاہم اپنے مقالے میں ''مغرب'' کو ''امریکہ اور مغربی یورپ'' ہی تک محدود کرتے ہیں۔ یہی فکر محمد وسیم (''اسلام اور مغرب کے علمی رجحانات'') اور جان ایل ایسپوسیٹو (''اسلام اور انتہا پسند مغرب'') کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مسلمانوں کی یورپ سے دشمنی سیاسی بنیادوں پر ہے، نہ کہ مذہبی بنیادوں پر۔ اور مسلمان مغرب سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اُن کے مذہب، اسلام کا احترام کرے'' (ص ۲۵)۔

تاہم عرصے سے میری یہ رائے ہے کہ مغرب کسی جغرافیائی حقیقت کا نام نہیں، بلکہ ایک طرزِ فکر ایک ثقافت، اور ایک منہاجِ حیات و عمل کا نام ہے۔ جاپان، تائیوان، سنگاپور اور ''نیا چین'' بھی اسی طرح مغرب ہیں،

☆ پروفیسر، کومکس (COMMECS) انسٹی ٹیوٹ آف بزنس اینڈ ایمرجنگ سائنسز، گلستانِ جوہر، کراچی۔

جس طرح فرانس، جرمنی، برطانیہ اور شمالی امریکہ۔ یہ بات ضرور ہے کہ اب سے سو سال پہلے مغرب کی قیادت یورپی اقوام کے پاس تھی، اور اب اس کا سرخیل امریکہ ہے، اور اس کے ساتھی یورپ اور ایشیا کے بعض دوسرے ممالک۔

مُجلّہ اجتہـــاد کے زیرِ نظر شمارے میں عیسائیت اور اسلام کے حوالے سے متعدد مضامین اور شذرات شامل ہیں۔ امریکہ کے موجودہ صدر جارج بُش اور ان کے ساتھی ''نئے قدامت پسند'' (Neo-Cons) اور پاپائے روم بینیڈکٹ کا تعلق بے شک نام نہاد عیسائی مغرب سے ہے، مگر مغرب ان کی شخصیات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ ''عزّت مآب پوپ بینیڈکٹ کے نام کھُلا خط''، اسلام کی صفائی میں پیش کی جانے والی ایک فدویانہ گزارش محسوس ہوتا ہے، اور اُن پر تبلیغ کی ایک اچھی معصومانہ کوشش۔ مگر اس اعتذاری رویّے سے متقابل کو رام کرنا میرے خیال میں کارِ عبث ہی ہوگا:

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ صنم آخر خدا نہیں ہوتا

جغرافی مغرب کی مقتدرہ کے یہ اراکین مغرب کی فکر، فلسفے اور عملی پالیسی کے نمائندے نہیں، بلکہ ایک رُوح کے جزوی مظاہر ہی کہے جاسکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہمارا مذہب، اہلِ کتاب سے مناقشت سے منع کرتا ہے، اس کا نام ہی امن و سلامتی ہے، یہاں جبر نہیں، جنگ نہیں، عقل کا استعمال ہے، رحم و رافت ہے، نہایت اچھی تبلیغ ہے۔ مگر انہیں اہداف بنا کر اسلام اور مغرب میں امن و اتحاد کی کوشش میرے خیال میں تحصیل لاحاصل ہے۔ عبدالقادر طیّب کی رائے ہے کہ مغرب عمومی مفہوم میں مذہب مخالف نہیں (ص ۸۴)۔ اور اصغر علی انجینیر ''اسلام اور مغربی دنیا'' کے عنوان سے کہتے ہیں کہ آج تہذیبوں کے درمیان کوئی تصادم موجود نہیں (ص ۳۷)۔ یہی نقطۂ نظر اس جریدے کی عمومی فضا کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر چہ محسن مظفر نقوی، اسلام اور مغرب کے حوالے سے جن نصف درجن مصری تصانیف کا حوالہ دیتے ہیں، اُن سب میں یہ تصادم واضح نظر آتا ہے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کی مشہورِ زمانہ تصنیف *The Clash of Civilization and the Remaking of World Order* کی جو تلخیص شمارے میں شامل ہے، وہ بھی اس کی غماز ہے۔ بقول اُن کے، مغرب میں ''اسلامی خطرے کے بارے میں تشویش بڑھ رہی ہے۔... مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں بلکہ اسلام ہے، ایک مختلف تہذیب جس کے افراد کو اپنی ثقافت کی برتری اور اپنی طاقت کی کم تری کا شدید احساس ہے۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے یا امریکی محکمۂ دفاع

نہیں بلکہ مغرب ہے۔ ایک مختلف تہذیب، جس کے افراد کو اپنی عالمگیر ثقافت پر یقین ہے۔ ....اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی برتر طاقت اُن پر اس ثقافت کو پوری دنیا میں پھیلانے کو فرض قرار دیتی ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تنازعے کے یہی اساسی اجزاء ہیں'' (ص ۲۸)۔ تاہم ''تقدیم'' میں مدیرِ اعلیٰ محترم محمد خالد مسعود کی رائے ہے کہ ''اس دور میں جہاں مغربی دانش وروں نے اسلام کو خطرہ قرار دیتے ہوئے اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کی چیخ پکار سے اسلام اور مغرب میں منافرت پھیلانے کی کوشش کی ہے، وہاں بعض مسلمانوں نے بھی مغرب کے خلاف دہائی دے رکھی ہے۔ اس صورتِ حال نے اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کر دیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس عالمی دور نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے فکری، دینی اور ثقافتی پیغام کو انسانیت کے مشترکہ سرمایہ کے طور پر پیش کریں اور مغرب جو روز بروز دین کے ساتھ اخلاقی اقدار سے بھی بیزار نظر آتا ہے، اُسے اسلام کی اخلاقی اقدار کی دعوت دیں'' (ص ۴)۔

مغربی تہذیب کے سارے تنوّع اور اختلافات کے باوجود اُس کے اقدارِ مشترکہ میں جو تقریباً دو سو سال کی فکر اور حرکیات سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں، کچھ عقائد ہیں اور کچھ اعمال۔ مغرب ایک فکر و فلسفے اور ایک روّیے کا نام ہے۔ اگرچہ وہاں اکثریت عیسائیوں کی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے عقیدے، ''آسمانی باپ سے محبت، دنیا سے بے رغبتی، انتقام اور جدال سے نفرت اور نوعِ انسانی کی خیر خواہی اور خدمت'' اس کی شناخت نہیں، بلکہ خدا کا استرداد (God is dead)، سیاست اور عملی زندگی سے مذہب کا اخراج، کاروبار میں زیادہ سے زیادہ نفع آوری (Maximization of Profit)، عملیت پسندی "That which works in Trace"، جسے امریکی فلسفیوں نے نتائجیت (Pragmatismn) اور آلاتیت (Instrumentalism) کا نام دیا ہے، بازاری معیشت، بلاقید اکثریتی رائے کا تقدس (وہ اکثریت جس نے سقراط کو موت کی سزا دی، اور ہمارے عیسائی بھائیوں کے مطابق جس نے براباس ڈاکو کو رہا کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دینے کا مشورہ دیا تھا)، فرد کی بلا روک ٹوک آزادی (یہ اور بات ہے کہ عیار حکمران اور سرمایہ دار کس طرح اُسے اپنی رسوم و قیود کا پابند بناتے ہیں)، یہ مظاہر دراصل مغرب کی اصل شناخت ہیں۔ اس طرح مغرب صرف شمالی امریکہ اور یورپ کا نام نہیں، بلکہ اُس روح اور روّیے کا نام ہے، جو ایشیا، افریقہ اور ہمارے درمیان بھی، جہاں بھی اس تہذیب کی فکر اور مظاہر پائے جائیں، موجود ہے۔ بے شک، ظلم و جبر، کشت و خون، غارت گری، لوٹ مار، یورپ کی پیداوار نہیں،

مگر مغرب نے انہیں ایک سائنس کا درجہ دے دیا ہے۔ اور اگر اسلام، امن وسلامتی، اور دینِ فطرت کا نام ہے، تو اس کے مظاہر جہاں بھی پائے جائیں، اسی تنویر کا اقتباس تصور ہونے چاہئیں کہ یہ انسانوں کے لیے اللہ کی ودیعت شدہ فطرت ہے۔

اس تناظر میں اگر ہم اسلام اور مغرب کے فکر، فلسفے، اہداف اور اُن کی حکمت عملی کا جائزہ لیں تو اختلاف اور ممکنہ اتفاق کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو سکتی ہے۔ مغرب کے نزدیک مذہب، ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہے، جب کہ اسلام دین کو فرد تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اُسے اجتماع پر مُسلّط کرنے کا خواہش مند ہے۔ مغرب کے نزدیک فلاح و کامیابی دنیا کی خوشی اور خوش حالی ہے، جب کہ اسلام دنیا کے ساتھ آخرت میں فلاح کا خواہش مند ہے، اور اس میں ترجیح حیاتِ اُخروی ہی کو ہے (وَ مَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ...... آل عمران :۱۸۵)۔ اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ ہم تو ایک مسافر کی طرح ہیں، جو کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گیا ہے (صحیح البخاری، کتاب الرّقاق، حدیث ۶۴۱۶؛ سنن ابن ماجہ، ابواب الزھد، حدیث ۴۱۱۴)۔ مغربی فکر میں حیاتِ اُخروی کی کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی فکر کے مطابق انسانی اور غیر انسانی (طبعی) وسائل کا استحصال دُرست ہے (Exploitation of Natural and Human Resources کی اصطلاحات قابلِ توجہ ہیں)۔ جب کہ اسلام کے مطابق نہ صرف سارے انسان بلکہ تمام جاندار اور بے جان مخلوق، اللہ کے غلام ہیں اور اس رشتے سے اللہ کی مقررہ حُدود ہی میں ان سے انتفاع درست ہے۔

مغرب فرد کی آزادی اور حقوق کا علَم بردار بنتا ہے، اور اسلام بھی چند حدود کے ساتھ ان اقدار کا حامی ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی بعید کو نہ بھی کُریدیں اور حال کے دو ڈھائی سال ہی پر توجہ مرکوز کریں تو مغرب کا ریکارڈ بہت زیادہ قابلِ تحسین نظر نہیں آتا۔ افریقہ کے سیاہ فام انسانوں کی غلامی اور ان کے ساتھ حیوانوں سے بدتر سلوک، دورِ روشن خیالی (Age of Enlightenment) سے پہلے کی نہیں بعد کی بات ہے۔ نئی دنیا کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کے نزدیک "[ریڈ] انڈین --- میں کوئی چیز انسانی نہیں، سوائے انسانی شکل کے"۔ اسی تہذیب کے فرزندوں نے چند ہی سالوں میں ۲۰ لاکھ سرخ ہندیوں کی آبادی کو ۲ لاکھ بنا کر انہیں صحراؤں اور جنگلوں میں دھکیل دیا تھا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں تو مغرب ساری دنیا کو غلام بنانے اور لوٹنے کے لیے نکلا تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا اور وسط میں دو عالمگیر جنگوں میں مغرب نے اپنی ساری ذہانت، مہارت اور وسائل تاریخ کی خوں ریز ترین اور تباہ کن ترین جنگوں میں جھونک دیئے، جن میں محتاط اندازوں کے مطابق ۵ کروڑ انسان مار دیے گئے اور اپاہج کر دیے گئے۔ ان میں قابلِ ذکر تعداد شہریوں کی تھی، جو بے محابا بم باری کا نشانہ بنے۔ دوسری جنگِ عظیم میں صرف امریکہ نے اپنے ایک کروڑ ۵۰ لاکھ سپاہی، ۳ لاکھ سے زائد ہوائی جہاز، ایک لاکھ ٹینک، اور بہت بھاری مقدار میں گولہ بارود کا استعمال کیا۔ صرف ۹ رمارچ ۱۹۴۵ء کو ۳۳۴ رامریکی بی-۲۹ بمبار طیاروں نے ٹوکیو پر ایک حملے میں ۸۴,۰۰۰ شہریوں کا صفایا کر دیا تھا۔ اس حملے میں ۴۰,۰۰۰ سے زائد شہری زخمی ہوئے تھے اور ۲۶۷,۱۷۱ عمارتیں تباہ کر دی گئی تھیں۔ یہ ایک شہر کی کہانی ہے، جو Alwin & Heidi Taffier نے بیان کی ہے (ملاحظہ ہو: *War and Anti-War*، ص ۴۰)، یورپ اور ایشیا کے دوسرے شہروں کا اس پر قیاس کر لیجیے۔ پھر اس جنگ کے اختتام کے قریب دنیا نے وہ ہول ناک تماشا دیکھا، جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ جاپان کے دو شہروں پر ۲ رامریکی ہوائی جہازوں نے دو مختلف قسم کے جوہری بم گرائے جن سے ۴ لاکھ سے زیادہ جانوں کے فوری اتلاف کے بعد آج تک جینیاتی عوارض کے اثرات باقی ہیں۔ آج مشرقی یورپ، فلسطین، عراق اور افغانستان میں جو تباہی جاری ہے، وہ ازمنہ تاریک (Dark Ages) کے جاہل وحشیوں کے کرتوت نہیں، بلکہ تعلیم یافتہ، روشن خیال، نرم گفتار (soft spoken) اور مہذب (sophisticate) مغرب کے کارنامے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مغرب کے معصوم عوام کا کارنامہ نہیں تھا، بلکہ مغرب کی مقتدرہ کا عمل ہے۔

مجلّہ اجتہاد کے زیرِ نظر شمارے میں مغرب کے اِن کارناموں کی کہیں جھلک نظر نہیں آتی۔ اجتہاد، بلاشبہ دین کی بقا اور دوام کا ضامن ہے، مگر اُسے زمانے کے جبر کے آگے سپر انداز بہر حال نہ ہونا چاہیے۔ اداریے میں علامہ محمد اقبال مرحوم کے حوالے سے ''جدید علم الکلام'' کی بات کی گئی ہے (اجتہاد کے پچھلے شمارے میں جدید ترکی کے ''اجتہادات'' پر ان کی تحسین کا ذکر تھا)۔ مگر اقبال کے ہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ وہ اپنی شاعری کو الہامی سمجھتے تھے، نہ کہ نثری تقریر کو۔ اُن کی غالب فکر میں انفعالی، اعتذاری سمجھوتے کے بجائے جارحانہ پیش قدمی کا فخر ونشاط ہے، اور اسی کے ذریعے روشن مستقبل کی نوید۔

ان سب باتوں کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس خوبصورت مجلّے کو ہمارے خواندہ نوجوانوں تک پہنچنا چاہیے کہ ایک مکالمے کی صورت پیدا ہو۔ علم و آگہی کا فروغ، سلیقے کے ساتھ اختلافِ رائے

اور برداشت کے بغیر ممکن نہیں اور اس کی یہ ایک لائقِ تحسین کوشش ہے۔اس کے لیے مدیر محمد خالد مسعود اور اراکین مجلسِ ادارت یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں۔